بابِ سخن
محسن زیدی

بابِ سخن

محسن زیدی

بابِ سخن

محسن زیدی

تقسیم کار

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹، گولامارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

نام کتاب : بابِ سخن

ناشر و مصنف : محسن زیدی

انتخاب و ترتیب : راج نرائن رازؔ، مخمور سعیدی

تعاون و اشتراک : ڈاکٹر اشفاق محمد خاں، ڈاکٹر بشیشر پردیپ

ماہ و سالِ اشاعت : مارچ ۲۰۰۰ء

تعداد : چار سو

قیمت : ایک سو روپے

سرورق : وجے کمپیوٹرس، دہلی

کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی

طباعت : ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پریس، نئی دہلی

زیرِ اہتمام

پریم گوپال متل

تقسیم کار:

موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

اپنے بچّوں

احسن، ارشد

شیبا، صائمہ

اور

سیّدہ صغرا

کے نام

فہرست

غزلیں

مقدمہ

میں محسن زیدی صاحب سے تقریباً دو سال ہی سے واقف ہوں۔ ان سے جان پہچان ایک غیرادبی ذریعہ سے ہوئی۔ میرے آنکھوں کے معالج ڈاکٹر طاہر زیدی نے مجھ سے ذکر کیا کہ ان کے چچا محسن زیدی دلّی سے لکھنؤ آگئے اور میرے قریب اندرانگر میں مقیم ہیں۔ محسن صاحب کا نام میرے لیے اجنبی نہ تھا۔ رام لعل کے وسیلے سے ان سے ملاقات ہوگئی۔ آمد و رفت، دید و باز دید شروع ہو گئی۔ لکھنؤ کی نئی کالونی اندرانگر اردو والوں سے اتنی دُور افتادہ ہے کہ یہاں جو دو چار اہلِ اُردو بستے ہیں ان کا وجود بسا غنیمت ہے۔ ہم ایک دوسرے سے مل کر اُردو ادب اور اُردو ادیبوں کے بارے میں معلومات اور خیالات کا تبادلہ کر لیتے ہیں۔ رام لعل کی مرگِ مفاجات کے بعد اندرانگر میں صرف چار اردو ادیب بچے ہیں: محسن زیدی، ڈاکٹر بشیشر پردیپ، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں اور من کمترین۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے قریب ہوتے جارہے ہیں۔

محسن زیدی کی شخصیت بھاری بھرکم ہے۔ تنومند حضرات اکثر بہت ہشّاش بشّاش خوش گفتار اور مجسّم قہقہہ ہوتے ہیں۔ محسن صاحب اس روایت کے برعکس کم سخن اور نرم گو ہیں۔ شاید اس کی یہ وجہ رہی ہو کہ انھوں نے معاشیات میں ایم-اے کیا ہے

اور انڈین اکانمک (معاشی) سروس میں اعلیٰ افسر رہے۔ معاشیات کو مغموم علم کہا جاتا ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں میرے زمانۂ طالبِ علمی میں ایک لڑکے نے پی ایچ۔ ڈی معاشیات میں داخلہ لیا۔ یاد اللہ قائم کرنے کے لیے وائس چانسلر ڈاکٹر امرناتھ جھا سے ملنے گیا اور اپنا تعارف دیا کہ اس نے معاشیات کی پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا ہے۔ اس عالمِ فرزانہ نے چھوٹتے ہی کہا۔ "مجھے زندگی بھر اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں بی اے میں معاشیات کا طالبِ علم تھا۔" یہ سنتے ہی ریسرچ اسکالر صاحب کا تمام ولولہ صاحبِ فراش ہو گیا۔ معاشیات گزیدہ محسن صاحب کو خود اپنی "کم سخنی" کا احساس ہے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں:

کہتے ہیں آپ آتا نہیں گفتگو کا فن
سچ یہ ہے جھوٹ بولنا آتا نہیں مجھے

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ طلاقتِ لسانی کے بڑے غازی ہوتے ہیں وہ اپنی گفتار میں جن لطیفوں اور نام نہاد واقعات سے نمک مرچ لگاتے ہیں، ان میں سے اکثر حقیقت سے بہت پرے ہوتے ہیں۔ اردو میں محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' نغز گوئی ہی کا اعلیٰ نمونہ نہیں، دروغ بافی کا بھی شاہکار ہے۔

زیرِ نظر مجموعے "بابِ سخن" سے پہلے محسن صاحب کے تین اور مجموعے آشکارا ہو چکے ہیں ــــ ۱۔ شہرِ دل (اگست ۱۹۶۱ء) ۲۔ رشتۂ کلام (۱۹۷۸ء) اور ۳۔ متاعِ آخرِ شب (فروری ۱۹۹۰ء)۔ آخری نام سے مجھے قرۃ العین حیدر کے ناول "آخرِ شب کے ہم سفر" (۱۹۷۹ء) کی یاد آ گئی۔

محسن صاحب کے چاروں دیوان محض غزلیات پر مشتمل ہیں۔

غالب نے کہا تھا:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

انتخاب بالعموم دوسرے لوگ کرتے ہیں جن کا مطالب شعر سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ انجمن ترقی اُردو ہند یا یوپی اردو اکادمی کے انتخاب کاروں کو دیکھ لیجیے۔ غالب کی مراد اپنے شعروں سے ہے۔ یہ کہنا بہتر ہوتا:

کمبخت شعر گوئی نے رُسوا کیا مجھے

مجھے اس میں شک ہے کہ غزل کے اشعار سے کسی کے دروں کی واقعی غمازی ہوتی ہے۔ غزل کے اشعار کو غزّال کی جذباتی سوانح سمجھ لینا دام مغالطہ کا شکار ہونا ہے۔ غزل کا قافیہ شاعر سے ایسا مضمون بندھوا سکتا ہے جس کا اسے کبھی تجربہ نہ ہوا ہو۔ جدید شاعروں کا یہ معاملہ ہے کہ وہ قدیم روایات کو توڑ سکتے ہیں لیکن اپنی معاصر شاعری کی روایت سے ہم قدم رہنا چاہتے ہیں۔ یعنی اُن کی غزل کے اشعار بھی لازماً ان کی آپ بیتی نہیں ہوتے۔ غزل کی ان تزویرات کے باوجود میں کوشش کروں گا کہ محسن صاحب کی غزلوں کے تجزیے سے ان کی اندرونی شخصیت کو برآمد کرسکوں۔

محسن صاحب روایتی غزل نہیں کہتے، اپنے دور کے آفریدہ ہیں۔ لیکن وہ خالص جدیدیے بھی نہیں۔ اپنی سلیم الطبعی کے باعث انھوں نے جدیدیت سے قابل قدر افکار و اظہار کو لے لیا لیکن ابہام یا اقدار شکنی سے مبرّا رہے۔ انھوں نے بالعموم علامتی طرزِ اظہار سے پرہیز کیا ہے اور براہِ راست طریقہ اختیار کیا ہے۔ کہیں تو وہ حقیقتوں کو اتنی سادگی سے بیان کر دیتے ہیں جیسے کوئی سامنے کی بات نثر کی وضاحت سے ادا کر دے۔ مثلاً:

ہمیں یہ بند کمروں کا مکاں کچھ بھا گیا اِتنا
کہ ہم کو اب کوئی آنگن کُھلا اچھا نہیں لگتا

چلتے چلتے ہو چلی ہے شام، محسنؔ اور ابھی
طے کیا ہو گا یہ مشکل ہم نے آدھا راستہ

اب سائے کے لیے کوئی دیوار ڈھونڈیے
اس شہر میں تو کٹ گئے اشجار سب کے سب
خبریں پرانی ہوگئیں دو ایک دن کے بعد
ردّی کے بھاؤ بک گئے اخبار سب کے سب

اِدھر اُدھر نہ اسے ڈھونڈ، وہ کہیں بھی نہیں
مکان سونا ہے، خالی ہے چارپائی، دیکھ

شمع ساتھ لے جانا، جب سفر پہ جانا تم
راستے میں ہو جائے کیا پتا اندھیرا کب

دلّی میں بس قیام ہے دو چار ماہ اور
پھر ہوگی میری سمتِ سفر میری راہ اور

اُسے تلاش کروں جاکے کس دیار میں اب
دِیا تھا اُس نے تو اپنا پتا یہیں کا مجھے

ان اشعار میں خیال اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے ہم روزانہ کی بات چیت میں کہتے ہیں لیکن غور کیجیے تو ہر شعر میں سادہ بیانی کے پیچھے کوئی سوچ، کوئی مشاہدہ، کوئی تشویش، کوئی پسند، یا ناپسند لہراتی دِکھائی دے گی۔ نثر کے ڈکشن میں ادا ہونے کے باوجود یہ اشعار نثری نہیں، اپنے دوش پر نئی شعریت لیے ہوئے ہیں۔

ان اشعار کے مطالب کو کھنگالتے وقت میں سب سے پہلے اس مقبولِ عام، بدنامِ

زمانہ دوامی اور آفاقی موضوع کو لیتا ہوں جس سے غزل عبارت رہی ہے، یعنی عورتوں سے بات چیت کرنا۔ خیال ہوتا ہے کہ محسؔن صاحب جیسے عمر رسیدہ اور سنجیدہ بزرگ کاروبارِ دل کے معاملات کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ چکے ہوں گے۔ لیکن میرؔ نے کہا تھا:

دل سے شوقِ رُخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھُو نہ گیا

اور یہ حقیقت ہے کہ سال خوردہ انسان جسمانی حیثیت سے کتنا ہی معذور کیوں نہ ہو جائے لیکن اس کی آوارہ نظری ہیرا پھیری سے باز نہیں آتی، سید صاحب بھی بھولے بھٹکے رومانی اشعار کہہ جاتے ہیں۔ ان کی عمر کو بھول جایئے، ان اشعار کو ٹھنڈی گرمیاں نہ کہیے، ان کے جذبے کی داد دیجیے:

اک دشتِ بے گیاہ تھی محسن یہ زندگی
شاداب سب کچھ اُس گلِ شاداب سے ہوا
اک بار پھر سے نغمہ سرا میرا سازِ دل
اک جنبشِ نگاہ کی مضراب سے ہوا

تصویر میں نکھر کے وہ ایسا لگا کہ بس
عکسِ بدن زبان سے خود بول اٹھا کہ بس

ق

رہتا تھا کبھی میری نگاہوں میں شب و روز
اک وقت تھا جب وہ مرا محبوبِ نظر تھا
کیا وہ کوئی جھونکا تھا نسیمِ سحری کا
یا رہ گذرِ خواب پہ خوشبو کا سفر تھا

یہ کون سیرِ چمن کو نکل پڑا دمِ صبح!
چمن میں کھل اُٹھے سارے گلاب ایک ہی ساتھ

اک نام لوحِ دل پر دوبارہ لکھ رہا ہوں
پہلے جو لکھ چکا تھا اُس نام کو مٹا کر

کِھلا ہوا تھا گلِ نوبہار کی صورت
اگر چہ عمر کی وہ آخری بہار میں تھا

سارے چہروں میں ہے ممتاز وہی اک چہرہ
رُو بہ رُو اُس کے کوئی اور حسیں کچھ بھی نہیں

میں ان میں سے کئی اشعار کو بہت پسند کرتا ہوں۔ مثلاً تصویر میں اتنا حسین لگنا کہ عکس بدن بول اُٹھا، رہ گذرِ خواب پہ خوشبو کا سفر، سارے گلابوں کا ایک ساتھ کِھل اُٹھنا، لوحِ دل پر ایک نام کی جگہ دوسرا نام لکھنا یعنی ایک محبوبہ کو بھلا کر دوسری سے دل لگانا جو کتنا فطری ہے، عمر کی آخری منزل میں بھی گلِ نوبہار ہونا۔ سراج اورنگ آبادی کا شعر ہے:

ہزار بلبلِ مسکیں کا خون باقی ہے
مقیم ہے چمنِ حُسن میں بہار ہنوز

رہ گذرِ خواب پہ خوشبو کے سفر کی کیا داد دی جائے، خالص ادبِ لطیف ہے۔ محسنؔ کے یہاں ایسی کئی بلیغ ترکیبیں ملتی ہیں۔ مثلاً:

لفظوں کی چادر، شجر لہو کے، خواب کے پیکر، سفر نا آشنا، خزاں نصیبوں، آواز کا جنگل، خوابوں کے جزیرے، سنگِ صدا وغیرہ۔

لیکن اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبّت کے سوا۔ افسانوں، ناولوں، نظموں، اور فلموں کو بھول جایئے، تو آپ پائیں گے کہ انسان کی زندگی کے بہت کم اوقات عشق کی نذر ہوتے ہیں۔ ماہ و سال کا بیشتر حصّہ روزانہ کی مکروہاتِ زندگی کی غذا بن جاتا ہے۔ دردؔ اگلے زمانے میں چیخ اُٹھے تھے:

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

شادؔ عظیم آبادی نے ناشاد ہو کر فریاد کی:

زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا، میں باز آیا

یہ حضرات موجودہ زندگی دیکھتے تو کیا کہتے، جس میں سہارے گھٹ گئے ہیں، بلائیں بڑھ گئی ہیں۔ موجودہ صنعتی تکنکی شہری معاشرے میں مادّی ترقی کے باوصف عام انسان جس اونچ نیچ، تنہائی، غیر محفوظیت، پسپائیت، بے مروّتی اور بے قدری سے دوچار ہے، وہ سب محسنؔ زیدی کا بھی مقسوم ہیں۔ چند مثالیں:

کبھی نزدیک آ کر رُو بہ رُو بھی ہوں ملاقاتیں
کہ ہمسایوں میں اتنا فاصلہ اچھا نہیں لگتا

سارے ہی چہرے، کبھی دیوار و در نا آشنا
لگ رہا ہے مجھ کو سارا ہی نگر نا آشنا

کہاں وہ پاسِ مراسم، وہ دوستی کا خیال
کہ اب رہا نہ کسی کو یہاں کسی کا خیال

ہے درمیانِ خنجر و سر فاصلے کا فرق
ورنہ سروں پہ ہے وہی خنجر یہاں وہاں

محسنؔ اتنی ارزاں کب زندگی رہی ہوگی
اس طرح ہوا ہوگا نقدِ جاں کا سودا کب

کس سے کیا کہا جائے، کس سے کیا سنا جائے
دل تو رنگِ محفل کو دیکھ کر بجھا جائے

ساری ندیوں کا ہے بہاؤ الگ
بہہ رہی ہے ہر ایک ناؤ الگ

عجیب غیر محفوظ دور ہے کہ جس میں بے نوا ہی نہیں
بے سہارا سرمایہ دار بھی غیر محفوظ ہوتا ہے:
محسنؔ تمام تر سروساماں کے باوجود
پوچھو نہ کتنی بے سروسامانیوں میں ہوں

ان کے کچھ اشعار تو صاف صاف موجودہ سیاسی صورتِ حال کے کسی منظر پارے کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اقلیتوں سے وفاداری کا مطالبہ:

کیوں ہم سے پوچھتے ہو کہ سا کن کہاں کے ہیں
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں کے ہیں
اس خاک سے اٹھا ہے ہمارا خمیر بھی
تم ہو اگر یہاں کے تو ہم بھی یہاں کے ہیں
میراثِ مشترک کے تو ہم بھی ہیں حصہ دار
چشم و چراغ ہم بھی اسی خانداں کے ہیں

۲۔ کیا یہ شعر اُردو برادری کے بارے میں ہے؟

تعداد اس قبیلے کی کچھ اتنی کم نہ تھی
جتنا اسے شمار میں کم کردیا گیا

اگر یہ اُردو والوں کے بجائے کسی اور گروہ کے لیے کہا گیا ہے تو بھی اردو والوں پر اس کا اطلاق زیادہ چستی سے ہوتا ہے۔

۳۔ فسادات۔ میر نے وسیع تباہ کاری کی یہ محاکات کی تھی:

جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

آج کل فرقے وارانہ فسادات یا دہشت پسندوں کے تشدّد کا ایسا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ شاید محسنؔ نے فرقے وارانہ فساد کو ذہن میں رکھ کر کہا ہوگا:

یوں سمجھ لو کہ بجز نامِ خدا کچھ نہ رہا
جل کے اس آگ میں سب خاک ہوا کچھ نہ رہا

کس کا سر، کس کی ردا، کس کا مکاں ڈھونڈتے ہو
قتل و غارت میں تو کوئی نہ بچا کچھ نہ رہا

سنتے ہیں کہ آباد یہاں تھا کوئی کنبہ
آثار بھی کہتے ہیں یہاں پر کوئی گھر تھا

مکینوں پر جو گذری پوچھتے کیا
مکانوں کی تو حالت سامنے تھی

مسلح پولیس کی نگہداشت کے باوجود چھرے بازی کی جان لیوا واردات ہوتی ہیں:

جب تھا محافظوں کی نگہبانیوں میں شہر
قاتل فصیلِ شہر کے اندر کہاں سے آئے

۴۔ دہشت پسندوں کی کارروائیوں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی مخصوص لیڈر کی جان لینے کے لیے بم یا زیرِ زمین سرنگ سے دھماکہ کرتے ہیں لیکن لیڈر کے ساتھ دوسرے کئی لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ بسااوقات یہ ہوتا ہے کہ جس کو ہدف بنایا تھا وہ بچ جاتا ہے، اس کے محافظ مارے جاتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

صد حیف کئی لوگ گئے جاں سے مرے ساتھ
قاتل کو تو مطلوب فقط میرا ہی سر تھا

۵۔ اہلِ اقتدار کا انجام سیاست میں یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ سابق سربراہِ حکومت زنداں میں آشیاں بندی کر لیتے ہیں، بعض اوقات تو بھٹو کی طرح جان ہی سے گذر جاتے ہیں:

تخت ہو جائے گا تختہ ذرا ٹھہرو تو سہی
دیکھ کر جاؤ جو اَب کھیل ہے ہونے والا

۶۔ یہ غزل محسنؔ نے لکھنؤ میں آکر حال میں لکھی ہے لیکن مجھے اس کی فضا ایمرجنسی کی یاد دلاتی ہے۔

موجِ گل، موجِ صبا سب خاموش
تیغِ گل چیں کے سوا سب خاموش
رُو بہ رُو اس کے سبھی مہر بہ لب
کوئی شکوہ نہ گلہ سب خاموش

سر قلم ہوگئے کتنوں کے مگر
جیسے کچھ بھی نہ ہوا سب خاموش
سب کو انجان سفر کا دھڑکا
راہ رو، راہ نما سب خاموش

کیا یہ ایمرجنسی میں انتظامیہ اور عدلیہ کی طرف اشارہ ہے:

وہ پہلے خلعت و انعام سے تسخیر ہو جانا
فقیہِ شہر کا پھر تابعِ شمشیر ہو جانا

اور اہل قلم نے قلم کی حرمت کو یوں برباد کیا:

اہلِ قلم لکھیں گے پھر اس کے خلاف کیا
جب رہن اس کے پاس قلم کر دیا گیا

کبھی کبھی محسنؔ جرأتِ مردانہ سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں:

رکھا جو سر بلند تو جائے گا سر بھی کیا؟
شمشیر ہوگئی تری محرابِ در بھی کیا؟

جھکا کے سر کسی دربار و در سے کب گذرے
کہ جب بھی گذرے اسی طرح بے ادب گذرے

یہ بے ادبی اہلِ اقتدار سے تھی۔ غالبؔ محبوب سے ترکی بہ ترکی لڑتے تھے۔ محسنؔ بھی لڑتے ہیں لیکن یہاں محبوب نہیں۔ قصرِ اقتدار کے کسی رکن یا دلال سے مکالمہ ہے:

وہی ہر چال اس کی شاطرانہ
وہی ہر بار میرا مات کھانا
جواب اپنا وہی تُرکی بہ تُرکی
سوالوں کا وہی رخ جارحانہ

۷۔ سیاسی چمچے، سیاسی قائدین اور اہلِ اقتدار کے ساتھ کچھ طفیلی، لیمو نچوڑ، چمچے رہتے ہیں۔ محسنؔ ان کی حیثیت جانتے ہیں:

کون ہے تابعِ مہمل کس کا
کس کا ہے کس پہ اثر جانتے ہیں
لوگ اُسے مصلحتاً کچھ نہ کہیں
اُس کی اوقات مگر جانتے ہیں

بلند ہو تو گیا دوسروں کے کاندھے پر
مگر وہ اور بھی کوتاہ اپنے قد سے ہوا

آخری شعر اس ادیب و شاعر کے لیے بھی صادق آتا ہے جو کسی نقّاد سے فرمائشی تنقید رقم کرا کے اپنا قد بڑھانا چاہتا ہے لیکن وہ بڑھتا نہیں گھٹ جاتا ہے۔ کچھ ایسی بات ذیل کے شعر میں کہی گئی ہے اگر رونمائی سے مراد کتابوں کی رسمِ رونمائی ہو:

سبھی ہیں چہروں پہ چہرے یہاں لگائے ہوئے
بڑے فروغ پہ اب رسمِ رونمائی ہے

۸۔ معاشرے کے باب میں ان اشعار کا مضمون بھی توجّہ طلب ہے:

گلہ تو یہ ہے کہ جتنے امیرِ شہر ہوئے
غریبِ شہر کو سب نا اُمید کرتے ہیں

کوئی کشتی میں تنہا جا رہا ہے
کسی کے ساتھ دریا جا رہا ہے

جیسے دو ملکوں کو اک سرحد الگ کرتی ہوئی
وقت نے خط ایسا کھینچا میرے اُس کے درمیاں

جہاں پر ختم تھے رشتے، وہاں سے
محبّت ہی محبت سامنے تھی

سماجی معنویت کے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے اس کے پیشِ نظر یہ کہنا درست ہوگا کہ محسؔن زیدی کا کلام ہم عصر معاشرے پر ایک بولتا چبھتا ہوا تبصرہ ہے۔ وہ محض شاعر ہی نہیں، سماجی حقیقت نگار بھی ہیں۔ یہ اعتراف کرتا چلوں کہ میں نے مختلف اشعار کا جو سماجی، سیاسی یا نفسیاتی پسِ منظر قیاس کیا ہے ضروری نہیں وہ شاعر کے عندیے کے مطابق ہو۔ میرے تجزیے کو قاری اساس تبصرہ سمجھ لیجیے۔

محسؔن کے دوسرے مجموعے ''رشتۂ کلام'' کے فلیپ میں مخمؔور سعیدی لکھتے ہیں کہ ان کی غزلوں کا سب سے نمایاں وصف واقعۂ کربلا کا پسِ منظر ہے۔ تیسرے مجموعے ''متاعِ آخرِ شب'' کا مقدمہ لکھتے وقت مخمؔور نے پھر یہ بات تفصیل سے اٹھائی۔ میں نے جب مقدمہ لکھنے کے لیے ''بابِ سخن'' کے مسودے کا مطالعہ کیا اس وقت تک محسؔن کے سابق مجموعوں میں مخمؔور سعیدی کا مشاہدہ نہیں پڑھا تھا لیکن مجھے ''بابِ سخن'' کے کئی اشعار کو دیکھنے سے محسوس ہوا کہ ان کی تحریک واقعۂ کربلا سے ہوئی ہے۔ بعد میں مخمؔور کی وضاحت کے بعد مجھے یقین ہو گیا۔ اس مجموعے کے حسبِ ذیل اشعار دیکھیے جن میں بیشتر میں برملا اور بعض میں بین السطور میں یہی معرکہ جلوہ آرا ہے:

تلوار کی وہ جنگ نہ تھی حق کی جنگ تھی
اعلان جس کا منبرو محراب سے ہوا

یہ ساری جنگ ہے صرف اک اصول کی خاطر
حصولِ زر، نہ زمیں، وجہ اس لڑائی کی ہے

وہ زیرِ خنجرِ قاتل نہ تھا گلو کوئی
وہ اک خیال تھا جس کو شہید کرتے رہے

آئے ہیں سنانے کے لیے ہم یہ سنائی
جو تیرے فدائی تھے ہوئے تجھ پہ فدا، سُن

قافلہ ایک اسیروں کا تھا پیچھے پیچھے
آگے آگے تھا کوئی نیزے پہ سر راستے بھر

کنارِ آب کسی کی جو پیاس یاد آئی
تو پھر رہا نہ ہمیں اپنی تشنگی کا خیال

دُور تک سبزہ کہیں ہے اور نہ کوئی سائباں
زیرِ پا تپتی زمیں ہے، سر پہ جلتا آسماں

چاروں طرف ہے پھر وہی طبل و علم کی دھوم
اب گرم ہو رہی ہے پھر اک رزم گاہ اور

یہ جور اہلِ عزا پر مزید کرتے رہے
ستم شعار محرّم میں عید کرتے رہے

کسی کی آنکھ ہوئی نم نہ مجلسِ غم میں
کوئی ہوا نہ مصائب پہ اشکبار اب کے

ہمارے فن کاروں، بالخصوص شاعروں کو اپنی حیثیت کے بارے میں بہت خوش گمانی ہوتی ہے۔ ان کی جتنی بھی قدر کی جائے، ان کا احساسِ تعلّی ہمیشہ اپنی ناقدری کا شاکی رہتا ہے۔ محسنؔ بھی اپنی ناقدری اور نقادوں کی بے بصیرتی کا گلہ کرتے ہیں:

اندھوں کے سامنے ہے جلانا چراغ کا
یہ روشنیِ فکر و فروغِ نظر بھی کیا

اِک نقدِ ہنر ہے کہ نہیں جس کی کوئی قدر
پاس، اس کے سوا، اور اثاثہ نہیں کوئی

خوشا نصیب ملا ہے وہ اعتبارِ نظر
کہ خوف ہے کسی ناقد، نہ نکتہ چیں کا مجھے

مرا کلام تو کیا، ناقدینِ فن محسنؔ
کلامِ حق میں بھی قطع و برید کرتے رہے

زمانہ بھر کی ذلت سامنے تھی
ہنر مندی کی قیمت سامنے تھی

ان اشعار میں یاس وافسوس کی لہر نمایاں ہے۔ مایوسی اور شکستگی کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

بزمِ کیف و مستی بھی بن گئی عزا خانہ
اب غزل کا لکھنا کیا، مرثیہ لکھا جائے

دوشِ ہوا پہ تنکوں کا یہ آشیانہ کیا
جس کو اُجڑ ہی جانا ہے وہ گھر بسانا کیا

مجھ سے ترکے میں عزیزو! تمھیں ملنا کیا ہے
پاس سرمایۂ دنیا ہے نہ دیں، کچھ بھی نہیں

محسنؔ جو ہم نہ ہوں گے تو کیا فرق پڑے گا
ہوگا نہ کوئی سلسلۂ شام و سحر بند

مجھے بتایا گیا تھا کہ ہے خدا سب کا
اسی بیان پہ میں بھی عقیدہ رکھتا تھا

غالبؔ نے کہا تھا ''ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے'' محسنؔ نے بھی صیغۂ ماضی 'عقیدہ رکھتا تھا' استعمال کر کے یہ تاثر دیا ہے کہ اب یہ عقیدہ نہیں ہے۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے میں ان کی اس وسیع المشربی کی داد دیتا ہوں:

یہ کیا ضرور کہ محسنؔ جو آپ سوچتے ہیں
وہی ہو سوچ سبھی کی، وہی سبھی کا خیال

میرا خیال ہے کہ محسنؔ کے زیرِ نظر مجموعے میں سے اچھے اشعار کا انتخاب کیا جائے تو وہ کم از کم ایک تہائی ضرور ہوں گے۔ بقیہ اوسط درجہ کے ہوں گے پست معیار کا ایک بھی شعر نہ ملے گا۔ میں نے اس کج مج بیانی میں جس کثرت سے شعر نقل کیے ہیں ان سے ان کی خوبی ثابت ہوتی ہے۔ دو شعر اور پیش کرتا ہوں جو مجھ کو پسند ہیں:

مرے گھر سے جو محسنؔ کوئی تصویرِ بتاں نکلے
اسے تم احتراماً جاکے بت خانے میں رکھ دینا
ہماری پیاس مے خواروں کو اکثر یاد آئے گی
ہمارے نام کا اک جام مے خانے میں رکھ دینا

یہ دونوں شعر خالص تغزّل کے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزل جدید مضامین میں اتنی نہیں کھلتی جتنی مروّجہ تغزّل کے اشعار میں۔ میں چند غزلوں کی نشاندہی کرتا ہوں جن کے بیشتر اشعار دل کو چھوتے ہیں۔ پڑھنے کے بعد عرصے تک تحت الشعور میں لہراتے رہیں گے:

زمانہ بھر کی ذلّت سامنے تھی

دور تک سبزہ کہیں ہے اور نہ کوئی سائباں

تصویر میں نکھر کے وہ ایسا لگا کہ بس

موجِ گل موجِ صبا سب خاموش

وہی ہر چال اس کی شاطرانہ

مجھے یقین ہے کہ قارئین 'بابِ سخن' میں داخل ہو کر گل گشت کرنے کے بعد مجھ سے اتفاق کریں گے۔

ڈاکٹر گیان چند جین

لکھنؤ
۱۵ر جنوری ۱۹۹۷ء

غزلیں

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کھُلا ہے بابِ سخن
(ولی دکنی)

○

آغاز اس کتاب کا جس باب سے ہوا
اُس کے ہی نام اُس کے ہی القاب سے ہوا

جتنا کہ جوئے دیدۂ خوناب سے ہوا
اُتنا زیاں نہ شہر کو سیلاب سے ہوا

آئی بس اِک متاعِ یقیں دشتِ جاں میں کام
کچھ فائدہ نہ مال نہ اسباب سے ہوا

آخر سبب ہے کیا جو عدو سے وہ جا ملا
کیونکر جُدا وہ حلقۂ احباب سے ہوا

تہہ جم چکی تھی گردِ زمانہ کی اس قدر
روشن پھر آئینہ نہ کسی آب سے ہوا

اِک بار پھر سے نغمہ سرا میرا سازِ دل
اک جنبشِ نگاہ کی مِضراب سے ہوا

تعبیر خواب کی تو بدلتے سُنی بھی ہے
تبدیل کیسے خواب کوئی، خواب سے ہوا

تلوار کی وہ جنگ نہ تھی حق کی جنگ تھی
اعلان جس کا منبر و محراب سے ہوا

مُنہ تک رہی ہے کس کا یہ زنجیرِ موجِ آب
آزاد کون، حلقۂ گرداب سے ہوا

دے کر طلوعِ مہرِ جہاں تاب کا پیام
رخصت یہ کون انجمنِ خواب سے ہوا

اک دشتِ بے گیاہ تھی محسنؔ پہ زندگی
شاداب سب کچھ اُس گلِ شاداب سے ہوا

○

رات اِک سانحہ ہُوا ہے عجب
صبح سے شہر کی فضا ہے عجب

اُس کی کوئی خبر نہیں آئی
دل کو دھڑکا سا اِک لگا ہے عجب

رکھیں کس رُخ پہ ہم جلا کے چراغ
کب کدھر سے چلے، ہوا ہے عجب

ہیں لہو رنگ آستینیں سب
وہ بھی ہو قاتلوں میں، کیا ہے عجب

اُس کو ڈھونڈیں تو کس حوالے سے
نام اُس کا عجب ، پتا ہے عجب

جن کی تاویل ہے نہ کچھ تعبیر
ذہن بھی خواب دیکھتا ہے عجب

اُس کی خاموشیوں میں لطفِ دگر
اُس کی باتوں میں کچھ مزا ہے عجب

سامنے کچھ نظر نہیں آتا
کاٹ لو موڑ راستہ ہے عجب

جنگ اس بار اپنے آپ سے ہے
محسنؔ اب کے تو رَن پڑا ہے عجب

○

ہمیں تو خیر کوئی دُوسرا اچھا نہیں لگتا
اُنھیں خود بھی کوئی اپنے سِوا اچھا نہیں لگتا

نہیں گر نغمۂ شادی نفیرِ غم سہی کوئی
کہ سازِ زندگانی بے صدا اچھا نہیں لگتا

ہمیں یہ بند کمروں کا مکاں کچھ بھا گیا اِتنا
کہ ہم کو اب کوئی آنگن کھُلا اچھا نہیں لگتا

کُچھ اتنی تلخ اُس دن ہو گئی تھی گفتگو اُن سے
کئی دن سے زباں کا ذائقہ اچّھا نہیں لگتا

کبھی نزدیک آکر رُو بہ رُو بھی ہوں ملاقاتیں
کہ ہم سایوں میں اِتنا فاصلا اچّھا نہیں لگتا

کٹھن رستوں پہ چلنا اپنی اُفتادِ طبیعت ہے
ہمیں آسان کوئی راستا اچّھا نہیں لگتا

اِسے ہم مرثیہ گویوں پہ محسنؔ چھوڑے دیتے ہیں
لکھیں ہم آپ اپنا مرثیہ اچّھا نہیں لگتا

○

زمانے بھر کی ذلّت سامنے تھی
ہُنرمندی کی قیمت سامنے تھی

شکستِ خواب کا عالم نہ پوچھو
بڑی کڑوی حقیقت سامنے تھی

نہاں سارا ہی چہروں سے عیاں تھا
دلوں کی سب کدورت سامنے تھی

مکینوں پر جو گذری پوچھتے کیا
مکانوں کی تو حالت سامنے تھی

جہاں پر ختم تھے رشتے وہاں سے
محبّت ہی محبت سامنے تھی

ق

نہ پوچھو کیسا ہنگامہ بپا تھا
عجب طُرفہ قیامت سامنے تھی

کوئی چہرہ نہ آئینہ تھا محسنؔ
بس اپنی چشمِ حیرت سامنے تھی

○

کیا دیکھتے ہو راہ میں رُک کر یہاں وہاں
ہے خاک و خوں کا ایک سا منظر یہاں وہاں

زیرِ نگیں اُسی کے سبھی قریہ و دیار
اُس کے ہی سب ہیں خیمہ و لشکر یہاں وہاں

ہے درمیانِ خنجر و سر فاصلے کا فرق
ورنہ سروں پہ ہے وہی خنجر یہاں وہاں

شیشے کے سب مکاں ہیں شکستہ اِدھر اُدھر
بکھرے پڑے ہیں شہر میں پتّھر یہاں وہاں

محفوظ رہ گیا نہ کوئی راستہ نہ موڑ
جایا کرو نہ گھر سے نکل کر یہاں وہاں

محسنؔ عجیب جس کا عالم ہے اور میں
کوئی دریچہ ہے نہ کوئی در یہاں وہاں

○

دُور تک سبزہ کہیں ہے اور نہ کوئی سائباں
زیرِ پا تپتی زمیں ہے سر پہ جلتا آسماں

جیسے دو ملکوں کو اِک سرحد الگ کرتی ہوئی
وقت نے خط ایسا کھینچا میرے اُس کے درمیاں

اب کے سیلابِ بلا سب کچھ بہا کر لے گیا
اب نہ خوابوں کے جزیرے ہیں نہ دل کی کشتیاں

لُطف اُن کا اب ہوا تو ہے مگر کچھ اِس طرح
جیسے صحرا سے گذر جائے کوئی ابرِ رواں

منحصر ہے ایسی اِک بنیاد پر اُس کا یقیں
جس طرح دوشِ ہوا پر کوئی تنکوں کا مکاں

بے زبانوں سے خموشی کا گلہ کیسا کہ جب
سو گئے لفظوں کی چادر تان کر اہلِ زباں

یہ سفر کیسا ہے محسنؔ جتنا بڑھتے جایئے
بڑھتی جائیں اُتنی ہی منزل بہ منزل دُوریاں

○

کبھی کسی کی سفارش نہ کچھ مدد سے ہُوا
کہ میرا کام ہُوا جب بھی ردّ و کد سے ہُوا

میں بے شمار ہُوا ورنہ کس شمار میں تھا
یہ معجزہ بھی اُسی اِسم کے عدد سے ہُوا

ثبوت اپنا دیا خود تو اعتبار مِلا
میں مستند نہ کسی غیر کی سند سے ہُوا

خود اپنی آگ میں جل بُھن کے رہ گئے بد خواہ
بُرا کسی کا نہ اُن کی دعائے بد سے ہُوا

بلند ہو تو گیا دوسروں کے کاندھے پر
مگر وہ اور بھی کوتاہ اپنے قد سے ہُوا

اُسے سنانے کو دل میں غبار کم تو نہ تھا
یہی بہت ہے نہ باہر میں اپنی حد سے ہُوا

جو خاک چاند پہ ڈالی خود اُس پہ آن پڑی
وہ خوار اپنے اِسی جذبۂ حسد سے ہُوا

مجھے جو تولا بھی محسنؔ تو کس ترازو سے
موازنہ یہ مرا کیسے نابلد سے ہُوا

○

یہ جورِ اہلِ عزا پر مزید کرتے رہے
ستم شعار محرّم میں عید کرتے رہے

ہمارے دم سے رہا دورِ بادہ پیمائی
کہ اپنے خون سے ہم مے کشید کرتے رہے

گلہ تو یہ ہے کہ جتنے امیرِ شہر ہوئے
غریبِ شہر کو سب نا اُمید کرتے رہے

کیا ہے ہم نے ہمیشہ ہی کاروبارِ زیاں
کہ سستا بیچ کے مہنگا خرید کرتے رہے

کسی سے شہرِ خموشاں میں کہتے سنتے کیا
ہم اپنے آپ سے گفت و شنید کرتے رہے

وہ زیرِ خنجرِ قاتل نہ تھا گلو کوئی
وہ اِک خیال تھا جس کو شہید کرتے رہے

مرا کلام تو کیا ناقدینِ فن محسنؔ
کلامِ حق میں بھی قطع و بُرید کرتے رہے

○

اب شہر میں وا ہو کوئی در یا کوئی در بند
اس شہر میں جب ہم پہ ہُوا اپنا ہی گھر بند

افکار پہ قدغن ہے تو اظہار کا در بند
از بسکہ ہوا ناطقۂ فکرو نظر بند

پہلے ہی سے ہم سمتِ سفر کیوں نہ بدل لیں
اِس موڑ سے آگے ہے اگر راہ گذر بند

کس عہد میں دیکھے نہیں آنکھوں نے نئے خواب
آنکھوں پہ ہوا بھی ہے کبھی خواب کا در بند

جب تک تھی تپش خاک میں رقصاں تھے شرارے
جب سرد ہوئی خاک ہُوا رقصِ شرر بند

مدّت سے نہ منظور ہوا کوئی عریضہ
کب سے ہے دُعاؤں پہ مری بابِ اثر بند

یہ سوچ کے شمشیر اُٹھائی نہیں جاتی
شامل صفِ اعدا میں ہیں اپنے بھی جگر بند

محسنؔ جو نہ ہم ہوں گے تو کیا فرق پڑے گا
ہو گا نہ کوئی سلسلۂ شام و سحر بند

○

صبا چلی نہ گلوں سے اُڑے شرار اب کے
غلط رہا بہت اندازۂ بہار اب کے

سمٹ کے تنگ ہوا اور حلقۂ زنجیر
ہوئی کچھ اور گرہ گیر زلفِ یار اب کے

کسی کی آنکھ ہوئی نم نہ مجلسِ غم میں
کوئی ہوا نہ مصائب پہ اشکبار اب کے

جنوں میں چاک گریباں تو کر چکے ہیں بہت
کریں گے اور ہی کچھ وضع اختیار اب کے

وہ جس کو ایک زمانے سے ہم تھے بھُولے ہوئے
وہ شخص یاد بہت آیا بار بار اب کے

بہت دنوں سے جو اُس ترکشِ نگاہ میں تھا
وہ تیر چل کے ہُوا دِل کے آر پار اب کے

شجر لہو کے جو سُوکھے ہوئے تھے برسوں سے
سُنا ہے ان پہ پھر آئے ہیں برگ و بار اب کے

چلو کہ آگئی محسنؔ ہماری باری بھی
کہ دشمنوں میں ہُوا اپنا بھی شمار اب کے

○

اگر چمن کا کوئی در کھُلا بھی میرے لیے
سموم بن گئی بادِ صبا بھی میرے لیے

مرا سخن بھی ہُوا اُس کے نام سے موسوم
عبث ہُوا مرا اپنا کہا بھی میرے لیے

یہی نہیں کہ وہ رستے سے موڑ کاٹ گیا
نہ چھوڑا اس نے کوئی نقشِ پا بھی میرے لیے

تعلقات کا رکھنا بھی توڑنا بھی محال
عذابِ جاں ہے یہ رسمِ وفا بھی میرے لیے

مجھے طویل سفر کا ملا تھا حکم تو پھر
کچھ اور ہوتی کشادہ فضا بھی میرے لیے

مرے لیے جو ہے زنجیر، میرا اوجِ نظر
کمند ہے، مری فکرِ رسا بھی میرے لیے

دوا ہے میرے لیے جس کی خاکِ پا محسنؔ
اُسی کا اِسم ہے حرفِ دُعا بھی میرے لیے

○

ٹھہرے ہوئے نہ بہتے ہوئے پانیوں میں ہوں
یہ میں کہاں ہوں کیسی پریشانیوں میں ہوں

اِک پل کو بھی سکون سے جینا مُحال ہے
کن دشمنانِ جاں کی نگہبانیوں میں ہوں

یوں جل کے راکھ خواب کے پیکر ہوئے کہ بس
اک آئینہ بنا ہوا حیرانیوں میں ہوں

جب راہ سہل تھی تو بڑی مشکلوں میں تھا
اب راہ ہے کٹھن تو کچھ آسانیوں میں ہوں

آساں نہیں ہے اتنا کہ بک جاؤں اُس کے ہاتھ
ارزاں نہیں ہوں خواہ فراوانیوں میں ہوں

مجھ کو بھی علم خوب ہے سب مدّ و جزر کا
میں بھی تو سب کے ساتھ انھیں پانیوں میں ہوں

محسنؔ تمام تر سر و ساماں کے باوجود
پوچھو نہ کتنی بے سر و سامانیوں میں ہوں

○

ہے یہی بہتر کہ چلیے اپنا اپنا راستہ
ورنہ روکیں گے سبھی اک دوسرے کا راستہ

تھے حصولِ مدّعا کے مختصر بھی راستے
منتخب ہم نے کیا خود ہی تو لمبا راستہ

گھر سے ہم نکلے تھے جن راہوں کی لے کر آرزو
بھُول بیٹھے ہیں اُنھیں راہوں میں گھر کا راستہ

اب کے پھر منہ دیکھتی رہ جائے گی موجِ بلا
پھر نکل آئے گا کوئی بینِ دریا راستہ

منزلیں مثلِ غبارِ کارواں اُڑتی ہوئیں
کیسا انجانا سفر ہے کیسا اندھا راستہ

زندگی کیا تھی ہماری، تھا مسلسل اِک سفر
راستے میں ہم کہیں ٹھہرے نہ ٹھہرا راستہ

چلتے چلتے ہو چلی ہے شام محسنؔ اور ابھی
طے کیا ہو گا بہ مشکل ہم نے آدھا راستہ

○

ہر روز نیا حشر سرِ راہ گذر تھا
اب تک کا سفر ایک قیامت کا سفر تھا

اندازۂ حالات تھا پہلے ہی سے مجھ کو
در پیش جو اَب ہے وہ مرے پیشِ نظر تھا

سنتے ہیں کہ آباد یہاں تھا کوئی کنبہ
آثار بھی کہتے ہیں یہاں پر کوئی گھر تھا

طے ہم نے کیا سارا سفر یکّہ و تنہا
جز گردِ سفر کوئی نہ ہمراہِ سفر تھا

صد حیف کئی لوگ گئے جاں سے مرے ساتھ
قاتل کو تو مطلوب فقط میرا ہی سر تھا

میری ہی طرح جاں سے گذر کر چلے آتے
کچھ اِس سے زیادہ تو نہ رستے میں خطر تھا

ق

رہتا تھا کبھی میری نگاہوں میں شب و روز
اِک وقت تھا جب وہ مرا محبوبِ نظر تھا

کیا وہ کوئی جھونکا تھا نسیمِ سحری کا
یا رہ گذرِ خواب پہ خوشبو کا سفر تھا

ہم جاکے کہاں بادیہ پیما ہوئے محسنؔ
جس دشت میں سبزہ نہ کہیں کوئی شجر تھا

○

یوں سمجھ لو کہ بجز نامِ خدا کچھ نہ رہا
جل کے اس آگ میں سب خاک ہُوا کچھ نہ رہا

کس کا سر، کس کی رِدا، کس کا مکاں ڈھونڈتے ہو
قتل و غارت میں تو کوئی نہ بچا کچھ نہ رہا

ہم کسی اور کے ہونے کی خبر کیا دیتے
گم ہوئے ایسے کہ اپنا بھی پتا کچھ نہ رہا

کچے رنگوں کی طرح اُڑ گئے سارے ہی حروف
کورے کاغذ پہ تھا جو کچھ بھی لکھا کچھ نہ رہا

محسنؔ اس طرح لُٹی محفلِ ساز و آواز
گُلِ نغمہ نہ کوئی برگِ نوا کچھ نہ رہا

○

یہ ہیں جو آستین میں خنجر کہاں سے آئے
تم سیکھ کر یہ خوئے ستم گر کہاں سے آئے

جب تھا محافظوں کی نگہبانیوں میں شہر
قاتل فصیلِ شہر کے اندر کہاں سے آئے

کیا پھر مجھے یہ اندھے کنوئیں میں گرائیں گے
بن کر یہ لوگ میرے برادر کہاں سے آئے

یہ دشتِ بے شجر ہی جو ٹھہرا تو پھر یہاں
سایہ کسی شجر کا میسّر کہاں سے آئے

اسلوب میرا سیکھ لیا تم نے کس طرح
لہجے میں میرا ڈھب مرے تیور کہاں سے آئے

ق

ماضی کے آئینوں پہ جِلا کون کر گیا
پیشِ نگاہ پھر وہی منظر کہاں سے آئے

دورِ خزاں میں کیسے پلٹ کر بہار آئی
پژمُردہ شاخ پر یہ گلِ تر کہاں سے آئے

محسنؔ اس اختصار پہ قربان جایئے
کوزے میں بند ہو کے سمندر کہاں سے آئے

○

پلٹتے جاؤ نہ سارے ہی باب ایک ہی ساتھ
تمام ہو نہ سکے گی کتاب ایک ہی ساتھ

نکل پڑے ہیں جب ایسی شکستہ کشتی میں
تو ہوں گے پھر تو سبھی غرقِ آب ایک ہی ساتھ

کبھی ملی نہ کسی خواب کی ہمیں تعبیر
ہمیشہ دیکھے ہیں خواب و سراب ایک ہی ساتھ

یہ کون سیر چمن کو نکل پڑا دمِ صبح
چمن میں کِھل اُٹھے سارے گلاب ایک ہی ساتھ

کسی پہ اُس کی نظر ایک سی نہ تھی پھر بھی
ہوئے تو سب ہوئے خانہ خراب ایک ہی ساتھ

مری نگاہ نے محسنؔ سبھی کو دیکھ لیا
رُخوں سے اُٹھ گئے سارے نقاب ایک ہی ساتھ

○

ساری ندیوں کا ہے بہاؤ الگ
بہہ رہی ہے ہر ایک ناؤ الگ

منتشر ہو گئے ستارے سب
اب جہاں چاہو جگمگاؤ الگ

راہ جب کوئی مشترک ہی نہیں
تم بھی اِک راستہ بناؤ الگ

اس خرابے میں کیوں رہو آباد
اپنی بستی کہیں بساؤ الگ

کوئی اک سمت جب سفر کی نہیں
اپنے اپنے سفر پہ جاؤ الگ

آندھیوں کا الگ الگ رُخ ہے
اپنا اپنا دِیا جلاؤ الگ

محسنؔ اب جو کہو، کہو کھُل کر
اِس تکلّف کو اب ہٹاؤ الگ

○

بُوند بُوند برسا ہے کُھل کے ابر برسا کب
تشنگی کا ہوتا ہے اس طرح مداوا کب

اشک اُس کی پلکوں پر ایک پل بھی ٹھہرا کب
کیا خبر گرا کوئی ٹوٹ کر ستارہ کب

شمع ساتھ لے جانا جب سفر پہ جانا تم
راستے میں ہو جائے کیا پتا اندھیرا کب

وہ تو ہر تماشائی بن گیا تماشا خود
ورنہ ہوتا اپنے آپ ختم یہ تماشا کب

دوست سچ ہی کہتے ہیں ختم کر کے رسم و راہ
درمیاں تو پانی تھا خون کا تھا رشتہ کب

راستہ تو بنتا ہے اپنے زورِ بازو سے
ورنہ کوئی دیتا ہے دوسرے کو رستہ کب

محسنؔ اتنی ارزاں کب زندگی رہی ہوگی
اِس طرح ہُوا ہوگا نقدِ جاں کا سودا کب

○

دوشِ ہوا پہ تنکوں کا یہ آشیانہ کیا
جس کو اُجڑ ہی جانا ہے وہ گھر بسانا کیا

ہم کو چھپا رہے ہو یہ آخر ہمیں سے کیوں
ہم سے ملا رہے ہو ہمیں غائبانہ کیا

ہم کون جزوِ خاص کسی داستاں کے تھے
کیسا ہمارا ذکر، ہمارا فسانہ کیا

آنکھوں میں اشک روک لیے اس خیال سے
مٹّی میں موتیوں کا لٹائیں خزانہ کیا

وہ بزمِ دوستاں نہ وہ اب کوئے دلبراں
باہر نکل کے گھر سے کہیں آنا جانا کیا

مقصد یہ کیا نہیں ہے کہ دُشمن کو ہو شکست
یہ جنگ ہو رہی ہے کوئی دوستانہ کیا

جب سب یہاں خموش ہیں دیوار کی طرح
پھر سُننا کیا کسی سے کسی کو سُنانا کیا

محسنؔ کہیں بھی لے کے ہمیں آب و دانہ جائے
اپنا یہاں پہ ٹھور کوئی کیا ٹھکانا کیا

○

جو اَب قصدِ سیر و تماشا کرو
تو سارا سفر پا پیادہ کرو

یہ چہرے تو پہچان میں آ گئے
رُخوں پر نیا کوئی غازہ کرو

کہاں وہ صفیں وہ جماعت کہاں
نمازیں ادا اب فرادیٰ کرو

کسے دخل کارِ مشیّت میں ہے
دِکھائے خدا جو بھی دیکھا کرو

اب اتنے بھی اندیشے اچھّے نہیں
تم اتنا بھی محسنؔ نہ سوچا کرو

○

نقش پانی پہ بنایا کیوں تھا
جب بنایا تو مٹایا کیوں تھا

گئے وقتوں کا ہے اب رونا کیوں
آئے وقتوں کو گنوایا کیوں تھا

بیٹھ جانا تھا اگر مثلِ غبار
سر پہ طوفان اُٹھایا کیوں تھا

میری منزل نہ کہیں تھی تو مجھے
دشت در دشت پھرایا کیوں تھا

وہ نہ ہمدم تھا نہ دمساز کوئی
حالِ دل اُس کو سُنایا کیوں تھا

دُور رہنا تھا جب اُس کو محسنؔ
میرے نزدیک وہ آیا کیوں تھا

○

اک آس تو ہے کوئی سہارا نہیں تو کیا
رستے میں کچھ شجر تو ہیں سایہ نہیں تو کیا

رہتا ہے کوئی شخص مرے دل کے آس پاس
میں نے اُسے قریب سے دیکھا نہیں تو کیا

تُو ہی بتا کہ چاہیں تجھے اور کس طرح
یہ تیری جستجو یہ تمنّا نہیں تو کیا

ہم دُور دُور رہ کے بھی چلتے رہے ہیں ساتھ
ہم نے قدم قدم سے ملایا نہیں تو کیا

ریگِ رواں کی طرح ہیں سارے تعلّقات
تم نے کسی کا ساتھ نبھایا نہیں تو کیا

ویسے ہمیں تو پیاس میں دریا کی تھی تلاش
اب یہ سراب ہی سہی دریا نہیں تو کیا

سوچا بھی تم نے دشت چمن کیسے بن گیا
محنت کا یہ عرق پہ پسینا نہیں تو کیا

محسنؔ مری نگاہ کو اچھّا لگا وہی
دنیا کی وہ نظر میں جو اچھّا نہیں تو کیا

○

یہ زمیں تو ہے زمیں، عرشِ بریں کچھ بھی نہیں
پرِ پروازِ تخیّل کے قریں کچھ بھی نہیں

اِک ترے ہونے پہ موقوف ہے سب کچھ ورنہ
یہ مرا حسنِ نظر حُسنِ یقیں کچھ بھی نہیں

سارے چہروں میں ہے ممتاز وہی اِک چہرہ
رُو بہ رُو اُس کے کوئی اور حسیں کچھ بھی نہیں

تاج پھر کیسا اگر افسرِ شاہانہ نہیں
مملکت کیسی اگر زیرِ نگیں کچھ بھی نہیں

مجھ سے ترکہ میں عزیزو! تمھیں ملنا کیا ہے
پاس سرمایۂ دُنیا ہے نہ دیں، کچھ بھی نہیں

خواب میں دیکھے تھے خوش رنگ مناظر کیا کیا
جاگتی آنکھوں سے دیکھا تو کہیں کچھ بھی نہیں

بس اُسی در پہ ہیں دنیا کی نگاہیں محسنؔ
جیسے سب کچھ ہے وہ در میری جبیں کچھ بھی نہیں

○

منزل و سمتِ سفر سے بے خبر، نا آشنا
ہم سفر مجھ کو ملا کیسا سفر نا آشنا

سارے ہی چہرے سبھی دیوار و در نا آشنا
لگ رہا ہے مجھ کو سارا ہی نگر نا آشنا

شمع اِک نا محرمِ اسرارِ شب ہنگامِ شام
اِک ستارہ آخرِ شب اور سحر نا آشنا

موجِ تیز و تند سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی
اپنے برگ و بار سے شاخِ شجر نا آشنا

یہ تو دُنیا ہے بدلتی رہتی ہے اس کی نظر
جس قدر یہ آشنا ہے اُس قدر نا آشنا

اُس نگاہِ ناز کو اپنی طرف سمجھا کیے
منکشف پھر یہ ہُوا ہم تھے نظر نا آشنا

کیا جُھکے گا اب کسی کے در پہ محسنؔ اپنا سر
زندگی بھر تو رہا سجدے سے سر نا آشنا

○

کیوں ہم سے پوچھتے ہو کہ ساکن کہاں کے ہیں
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں کے ہیں

اِس خاک سے اُٹھا ہے ہمارا خمیر بھی
تم ہو اگر یہاں کے تو ہم بھی یہاں کے ہیں

میراثِ مشترک کے تو ہم بھی ہیں حصّہ دار
چشم و چراغ ہم بھی اِسی خانداں کے ہیں

اپنی صدائے دل پہ بڑھائیں گے ہم قدم
پابند کیا کسی جرسِ کارواں کے ہیں

باقی ابھی تو اور ہیں اوراقِ زندگی
تم نے پڑھے جو ہیں وہ ورق درمیاں کے ہیں

تم نے بھی کون سا نیا افسانہ لکھ دیا
سارے ہی واقعات مری داستاں کے ہیں

سچ بول کر زبان قلم بھی ہوئی تو کیا
چرچے تو ہر زبان پہ میری زباں کے ہیں

محسنؔ جُھکا رہے گا اِسی آستاں پہ سر
سجدہ گزار ہم تو اِسی آستاں کے ہیں

○

کوئی دیوار نہ در جانتے ہیں
ہم اسی دشت کو گھر جانتے ہیں

جان کر چپ ہیں وگرنہ ہم بھی
بات کرنے کا ہُنر جانتے ہیں

یہ مہم ہدیۂ سر مانگتی ہے
اِس میں ہے جاں کا خطر جانتے ہیں

لد گئی شاخِ لہو پھولوں سے
آئیں گے اب کے ثمر جانتے ہیں

جان جانی ہے تو جائے گی ضرور
ہم دُعاؤں کا اثر جانتے ہیں

ق

کون ہے تابعِ مہمل کس کا
کِس کا ہے کِس پہ اثر جانتے ہیں

لوگ اُسے مصلحتاً کچھ نہ کہیں
اُس کی اوقات مگر جانتے ہیں

رات کس کس کے اُڑے ہیں پُرزے
شہر میں کیا ہے خبر جانتے ہیں

رات کاٹے نہیں کٹتی ہے مگر
رات ہے تا بہ سحر جانتے ہیں

ہم نے بھی دیکھی ہے دنیا محسنؔ
ہے کِدھر کِس کی نظر جانتے ہیں

○

جانا ہے اُسی سمت کہ چارہ نہیں کوئی
جس سمت کو رستہ بھی نکلتا نہیں کوئی

بس دل کا ہے سودا کوئی بازی نہیں سر کی
تھوڑا سا ہے نقصان زیادہ نہیں کوئی

منجدھار میں کشتی کا بدلنا نہیں منظور
ایسی مجھے ساحل کی تمنّا نہیں کوئی

ہر شخص یہاں گنبدِ بے در کی طرح ہے
آواز پہ آواز دو ، سُنتا نہیں کوئی

ہم سینہ سِپر آگئے میدانِ وغا میں
اب کیوں صفِ اعدا سے نکلتا نہیں کوئی

مانا کہ بُرا ہے جو کم آمیز ہوں اتنا
یہ تیرا تغافل بھی تو اچّھا نہیں کوئی

وہ شعبدہ گر ہی نہ رہا ، کھیل ہُوا ختم
ہونے کو بس اب اور تماشا نہیں کوئی

اِک نقدِ ہُنر ہے کہ نہیں جس کی کوئی قدر
پاس اِس کے سِوا اور اثاثہ نہیں کوئی

پامالیِ گلشن کی یہ تصویر ہے محسؔن
شادابیِ گلشن کا یہ نقشہ نہیں کوئی

○

کسی کے دوش نہ مرکب سے استفادہ کیا
یہاں تلک کا سفر ہم نے پا پیادہ کیا

جہاں پہ دیکھے قدم اپنے کچھ بھٹکتے ہوئے
وہیں ٹھہر کے فروزاں چراغِ بادہ کیا

لباس بدلے نہیں ہم نے موسموں کی طرح
کہ زیبِ تن جو کیا ایک ہی لبادہ کیا

امیرِ شہر سبھی تھے شریکِ مشقِ ستم
کسی نے کم تو کسی نے ستم زیادہ کیا

ہر ایک بار قدم بُت کدے میں لوٹ آئے
خدا گواہ ہے مسجد کا جب ارادہ کیا

بچھڑنے والوں میں ہم جس سے آشنا کم تھے
نہ جانے دل نے اُسے یاد کیوں زیادہ کیا

کوئی اکیلا تو میں سادگی پسند نہ تھا
پسند اُس نے بھی رنگوں میں رنگ سادہ کیا

بہت ہی تنگ تھی محسنؔ یہ رہ گذارِ غزل
ہم اہلِ فکر و نظر نے اِسے کشادہ کیا

○

ہمدانقتوں کا ہے یہ جشنِ رونمائی دیکھ
تو اب جو دیکھ سکے اپنی جگ ہنسائی دیکھ

وہ زہر گھول رہا ہے لہو کے رشتوں میں
عجب ہے اُس کی یہ ترکیبِ کیمیائی دیکھ

اِدھر اُدھر نہ اُسے ڈھونڈ وہ کہیں بھی نہیں
مکان سُونا ہے خالی ہے چار پائی دیکھ

میں پاس رہ کے بھی تیرے قریب آ نہ سکا
مری پہنچ کو نہیں میری نارسائی دیکھ

نظر میں چڑھ کے بھی دنیا کی گر گیا کہ نہیں
کہا تھا تجھ سے نہ کر اتنی خود ستائی دیکھ

معاملات میں آپس کے نفع و نقصاں کیا
حساب دل کا ہے اس میں نہ آنہ پائی دیکھ

کہا تھا کھول نہ اپنی زبان اُس کے خلاف
یہ اب ہُوا ہے جو انجامِ لب کُشائی ، دیکھ

یہاں جو رہنا ہے محسنؔ تو اُس سے بُعد نہ رکھ
امیرِ شہر سے اُس کی ہے آشنائی دیکھ

○

نہ کوئی کشف نہ کوئی کرشمہ رکھتا تھا
تو کیوں عبث وہ اُمیدِ تماشا رکھتا تھا

کیا ہے اُتنا ہی مایوس بھی اُسی نے مجھے
میں جس سے جتنی توقّع زیادہ رکھتا تھا

ہُوا تھا شہر کا منظر نہ کوئی زیر و زبر
وہ اپنے سامنے نقشہ ہی اُلٹا رکھتا تھا

اُٹھاتا اُس پہ میں تلوار کس طرح کہ وہ شخص
کتاب ہاتھ پہ سر پر عمامہ رکھتا تھا

لپٹ گئے مرے پانْو سے یہ در و دیوار
یہاں سے کُوچ کا ورنہ ارادہ رکھتا تھا

بہت پسند تھی اُس کو دُھواں دُھواں سی فضا
چراغ شام سے گھر کا بُجھا سا رکھتا تھا

غبار سر پہ تو جلتی زمین زیرِ قدم
غریبِ شہر یہی کچھ اثاثہ رکھتا تھا

مجھے بتایا گیا تھا کہ ہے خدا سب کا
اسی بیان پہ میں بھی عقیدہ رکھتا تھا

سخنوروں میں تھا محسنؔ سخن جدا اُس کا
الگ وہ طرز، الگ اپنا لہجہ رکھتا تھا

○

نہ آسمان کا رکھا نہ اِس زمیں کا مجھے
ڈبویا اُس نے تو چھوڑا نہیں کہیں کا مجھے

اُسے تلاش کروں جا کے کس دیار میں اب
دِیا تھا اُس نے تو اپنا پتا یہیں کا مجھے

میں ایک بار ترے راستے سے کیا بھٹکا
کہ عمر بھر نہ ملا راستہ کہیں کا مجھے

دیارِ غیر میں مانوس سی مہک کیسی
لگے ہے بوُ سے یہ گُل اپنی سرزمیں کا مجھے

سوال کرکے میں اب کس قدر پشیماں ہوں
کہ وسوسہ تھا تمھاری اسی نہیں کا مجھے

خوشا نصیب ملا ہے وہ اعتبارِ نظر
کہ خوف ہے کسی ناقد نہ نکتہ چیں کا مجھے

عطا ہوا مجھے محسنؔ یہ فرشِ مخمل کیوں
کہ جب مزاج ملا بوریا نشیں کا مجھے

○

تصویر میں نکھر کے وہ ایسا لگا کہ بس
عکسِ بدن زبان سے خود بول اُٹھا کہ بس

پہلے اکیلا میں تھا تماشا بنا ہوا
پھر اُس کے بعد ایسا تماشا ہُوا کہ بس

مرنے کے جتنے دل میں تھے ارمان رہ گئے
یاروں کو زندگی کا وہ چسکا لگا کہ بس

بابِ اثر دُعاؤں سے کیا اب بھی دُور ہے
کیا اور ہوں بلند یہ دستِ دُعا کہ بس

اپنے سِوا نگاہ میں سب تھا دُھواں دُھواں
طاری خودی کا ہم پہ وہ نشّہ رہا کہ بس

ممکن نہیں کہ شمع جلے اور دُھواں نہ ہو
لیکن میں اپنی آگ میں ایسا جلا کہ بس

کیا ہر طرف یہ راہِ ملامت ہی جائے گی
اِس کے سِوا ہے اور کوئی راستہ کہ بس

ہر دن رہے گا حشر کا دن کیا اِسی طرح
جاری رہے گا روز یہی سلسلہ کہ بس

اب تو یہاں سے منزلِ امکاں بھی ختم ہے
آگے یہاں سے اور بڑھے قافلہ کہ بس

محسنؔ نہ اب کے بچتا کسی کے بھی تن پہ سر
وہ تو زبانِ تیغ نے خود کہہ دیا کہ بس

○

آبادیوں کے مٹ گئے آثار سب کے سب
تاراج ہوگئے درو دیوار سب کے سب

یہ تو رفاقتوں کے سفر میں ہے پہلا موڑ
اب اِس کے بعد موڑ ہیں دُشوار سب کے سب

ہم فصلِ کشتِ جاں کو جو بیچیں تو کس کے ہاتھ
ہم پر ہیں بند کُوچہ و بازار سب کے سب

اب سایے کے لیے کوئی دیوار ڈھونڈیے
اِس شہر میں تو کٹ گئے اشجار سب کے سب

ہونا ہے ہم سبھی کو جو مصلوب ایک دن
پھر کیوں چلیں نہ مل کے سرِ دار سب کے سب

شاخِ نہالِ غم کی ہے شانِ نُمو الگ
ہوتے کہاں ہیں نخل ثمر بار سب کے سب

خبریں پرانی ہوگئیں دو ایک دن کے بعد
ردّی کے بھاؤ بِک گئے اخبار سب کے سب

محسنؔ ہے یہ نگر تو مجھے جان سے عزیز
رہتے ہیں اِس نگر میں مرے یار سب کے سب

○

رکھا جو سر بلند تو جائے گا سر بھی کیا
شمشیر ہو گئی تری محرابِ در بھی کیا

ہیں لوحِ وقت پر تو سبھی نقش نا تمام
یہ میرے روز و شب مری شام و سحر بھی کیا

کیا ہو گی یہ زمین دو بارہ لہو لہان
بادل لہو کے برسیں گے بارِ دگر بھی کیا

منزل ہی جب نہیں کوئی پیشِ نگاہ اب
پھر خاص کوئی رُخ کوئی سمتِ سفر بھی کیا

گھر کے لیے ضرور ہیں دیوار و در مگر
گھر ہی نہیں رہا تو یہ دیوار و در بھی کیا

رہ رہ کے جیسے دل میں کھٹکتی ہے کوئی شے
اس کی نگاہِ لُطف میں تھا نیشتر بھی کیا

اندھوں کے سامنے ہے جلانا چراغ کا
یہ روشنیِ فکر و فروغِ نظر بھی کیا

جتنے ہی کور چشم ہیں محسنؔ یہ دیدہ ور
اُتنے ہی بے خبر ہیں یہ اہلِ خبر بھی کیا

○

دِلّی میں بس قیام ہے دو چار ماہ اور
پھر ہو گی میری سمتِ سفر میری راہ اور

یا ہو گئی ہے منزلِ امکاں کچھ اور دُور
یا بڑھ گیا ہے کچھ مرا طولِ نگاہ اور

یہ روز و شب کا سلسلہ تبدیل کچھ تو ہو
روشن ہوں آسماں پہ کوئی مہر و ماہ اور

واضح ہے تیرگی ہی نہ واضح ہے روشنی
اس شہر کا ہو جیسے سپید و سیاہ اور

بربادیوں کا صرف تمھیں سے گلہ نہیں
ہیں کچھ شریکِ حال مرے خیر خواہ اور

چاروں طرف ہے پھر وہی طبل و علَم کی دُھوم
اب گرم ہو رہی ہے پھر اک رزم گاہ اور

اے روشنیِ طبع یہ کیا ماجرا ہُوا
روشن ہوئے جو حرف ہوئے کچھ سیاہ اور

محسنؔ کسی کی جان سلامت نہیں یہاں
اب جا کے ڈھونڈیے کہیں جائے پناہ اور

○

زنجیر ہوئی بھی ہے کہیں موجِ ہوا، سُن
آزادیِ اظہار پہ قدغن نہ لگا، سُن

آئے ہیں سُنانے کو تجھے ہم یہ سُنانی
جو تیرے فدائی تھے ہوئے تجھ پہ فدا، سُن

کچھ اور ہوئیں دست دراز اب کے ہوائیں
محفوظ نہیں اب تری دستار و قبا، سُن

مقتول پہ جو گذری سو گذری سرِ مقتل
قاتل کا مگر حشر بالآخر جو ہُوا، سُن

یہ سارے مکاں ریت پہ تعمیر ہوئے ہیں
گذری ہے یہ کیا کہتی ہوئی موجِ ہوا، سُن

آئندہ نہ اب پوچھنا کیا ہے مجھے مطلوب
یہ ہاتھ نہیں کوئی مرا دستِ گدا، سُن

آواز کے جنگل میں نہ آواز سے گھبرا
آئیں گے شب و روز یہاں سنگِ صدا، سُن

محسنؔ نہیں سُنتا ہے نہ سُن غیر کی باتیں
میں تو ترے اپنوں میں ہوں میرا تو کہا سُن

○

آئے ہیں ساحلوں پر سب کشتیاں جلا کر
اب تو یہیں رہیں گے ہم بستیاں بسا کر

ہر زاویے سے ہم نے دیکھا ہے شب کا منظر
شمعیں کبھی جلا کر شمعیں کبھی بجھا کر

اک نام لوحِ دل پر دو بارہ لکھ رہا ہوں
پہلے جو لکھ چکا تھا اُس نام کو مٹا کر

برباد اب نہیں میں اس شہرِ آرزو میں
آباد ہو گیا ہوں دل میں تجھے بسا کر

اُس سے مرا تعلّق کچھ تھا بھی کچھ نہیں بھی
دُنیا نے رکھ دی لیکن اِک داستاں بنا کر

آویزاں کر رہا ہوں ہر در پہ ایک چہرہ
اِک شمع رکھ رہا ہوں ہر طاق پر جلا کر

دِلّی سے جا رہا ہوں محسنؔ مگر نہ پوچھو
کیا کچھ یہاں سے لے کر کیا کچھ یہاں گنوا کر

○

سرِ موج آب کہیں کہیں
ملے کچھ حباب کہیں کہیں

وہ نظر گئی جو اِدھر اُدھر
کُھلا دل کا باب کہیں کہیں

تھے جو نقش کتبۂ خاک پر
مِلے زیرِ آب کہیں کہیں

گیا رائگاں تو نہ خونِ دل
کِھلے کچھ گلاب کہیں کہیں

یہ زمیں کہیں پہ جو خشک ہے
تو ہے آب آب کہیں کہیں

کہاں محسنؔ اُس کو میں ڈھونڈتا
وہ تھا خواب خواب کہیں کہیں

○

کوئی کشتی میں تنہا جا رہا ہے
کسی کے ساتھ دریا جا رہا ہے

یہ بستی بھی نہ کیا راس آئی اُس کو
اُٹھا کر کیوں وہ خیمہ جا رہا ہے

کہیں اِک بوند بھی برسا نہ پانی
کہیں بادل برستا جا رہا ہے

دِیے ایک ایک کر کے بجھ رہے ہیں
اندھیرا ہے کہ بڑھتا جا رہا ہے

پہاڑ اوپر تو نیچے کھائیاں ہیں
جہاں سے ہو کے رستہ جا رہا ہے

وہ واپس لے رہا ہے قرض اپنا
ہمارے پاس سے کیا جا رہا ہے

○

کہاں وہ پاسِ مراسم وہ دوستی کا خیال
کہ اب رہا نہ کسی کو یہاں کسی کا خیال

کچھ ایسا بیٹھ گیا دل میں تیرگی کا خیال
کہ ڈر گیا ہوں جو گذرا ابھی روشنی کا خیال

جو چل پڑے تو پسِ پشت مڑ کے دیکھنا کیا
سفر پہ نکلے تو پھر کیسا واپسی کا خیال

کنارِ آب کسی کی جو پیاس یاد آئی
تو پھر رہا نہ ہمیں اپنی تشنگی کا خیال

اَنا ہزار مخالف رہی پرستش کی
مگر نہ سر سے گیا اُس کی بندگی کا خیال

بس اِک خیال تھا اور میں اُسی میں گم صُم تھا
رہا کسی کی توجہ نہ بے رُخی کا خیال

یہ کیا ضرور کہ محسنؔ جو آپ سوچتے ہوں
وہی ہو سوچ سبھی کی وہی سبھی کا خیال

○

مرا نہ دخل کوئی اُس کے کاروبار میں تھا
سبھی سیاہ و سفید اُس کے اختیار میں تھا

مجھے پسند تو خود ہی تھی پانو میں زنجیر
میں قید اپنے ہی کھینچے ہوئے حصار میں تھا

بس اِتنی یاد ہے اُس بزمِ مے کشاں کی مجھے
کہ جب سرور میں سب تھے تو میں خمار میں تھا

کِھلا ہوا تھا گلِ نو بہار کی صورت
اگرچہ عمر کی وہ آخری بہار میں تھا

خبر نہیں کہ زمانہ تھا منتظر کس کا
کہ میں یہاں تو خود اپنے ہی انتظار میں تھا

تری نگاہ سے گر کر ہوا جو ذرّۂ خاک
وہ اک ستارہ تھا جب چشمِ اعتبار میں تھا

اکیلا میں تھا، نہ ہمدم نہ ہم سفر نہ چراغ
فقط غبارِ سفر ساتھ رہ گذار میں تھا

میں اجنبی تو نہیں کوئی شہرِ دلّی میں
مرا قیام بھی محسنؔ اِسی دیار میں تھا

○

سرِ شام روز وہی دِیے
نہ جلے ہوئے نہ بُجھے ہوئے

وہی روز روز کا جاگنا
وہی رات رات کے رتجگے

وہی اک مدار پہ زندگی
وہی صبح و شام کے سلسلے

وہی تیری یاد کرن کرن
وہی خواب تیرے خیال کے

وہی اک سفر سرِ دشتِ جاں
وہی ہجرتیں وہی فاصلے

وہی میرا اپنا کہا ہوا
وہی سب ہے اب مرے سامنے

وہ جو محسنؔ آئے تھے ابر اِدھر
کہیں اور جا کے برس گئے

○

وہی ہر چال اُس کی شاطرانہ
وہی ہر بار میرا مات کھانا

جواب اپنا وہی تُرکی بہ تُرکی
سوالوں کا وہی رُخ جارحانہ

ہوئیں مسدود جتنی بھی تھیں راہیں
کہیں باہر نہ اب آنا نہ جانا

وہی ہے روز و شب محنت مشقت
وہی ہے زندگی کا کار خانہ

یہاں تو کھیتیاں سوکھی پڑی ہیں
کہاں لے آیا مجھ کو آب و دانہ

وہ آ بسا مرے خوابوں میں اُس کا
نظر لیکن کسی صورت نہ آنا

وہی شام و سحر اک کھیل محسنؔ
چراغوں کا جلانا اور بجھانا

○

ذرا سی دیر میں طوفاں گزرنے والا ہے
یہ ریت کا جو محل ہے بکھرنے والا ہے

ذرا سی دیر کو ہے لطفِ نوکِ نشتر بھی
یہ زخمِ دل بھی بہت جلد بھرنے والا ہے

حصارِ آب کا ہے یہ طلسم چند گھڑی
چڑھا ہُوا تھا جو دریا اُترنے والا ہے

دِکھا رہا ہے جو ساحل کی خوش نما تصویر
وہی سفینوں کو غرقاب کرنے والا ہے

بڑا سکوت ہے ساحل پہ شام سے محسنؔ
کوئی پھر آج کی شب پار اُترنے والا ہے

○

وہ پہلے خلعت و انعام سے تسخیر ہو جانا
فقیہہِ شہر کا پھر تابعِ شمشیر ہو جانا

لکھا مٹ جائے گا سارا ورق رہ جائے گا سادہ
کسی بھی نقش کا پانی پہ کیا تحریر ہو جانا

چمن میں کیسا آیا موسمِ دیوانہ گر اب کے
کہ ہر وحشی کا اپنے آپ ہی زنجیر ہو جانا

جھٹکنا چاہا دامن سے بہت گردِ تعلق کو
مگر ہر بار اس کا بڑھ کے دامن گیر ہو جانا

کوئی مشکل نہیں پیکر تراشی خواب میں محسنؔ
مگر ہر خواب کا آساں نہیں تعبیر ہو جانا

○

یا تو سرِ غیور کو خم کر دیا گیا
جب خم نہ ہو سکا تو قلم کر دیا گیا

کچھ بھی کہیں سے بیش نہ کم کر دیا گیا
سب حال ہُو بہُو تو رقم کر دیا گیا

تعداد اُس قبیلے کی کچھ اِتنی کم نہ تھی
جتنا اُسے شمار میں کم کر دیا گیا

اہلِ قلم لکھیں گے اب اُس کے خلاف کیا
جب رہن اُس کے پاس قلم کر دیا گیا

اب کوئی حرف بھی نہ ستم گر پہ آئے گا
باہر لغت سے لفظِ ستم کر دیا گیا

محسنؔ یہ آج شہہ کا مصاحب ہے کیوں ملول
منصب میں اپنے کیا اُسے کم کر دیا گیا

○

لے کے پیغامِ جنوں زلفِ گرہ گیر بڑھی
دلِ وحشی کی طرف پھر وہی زنجیر بڑھی

میں نے سب دیکھ لیا سعیِ طلب کا انجام
اِن لکیروں سے نہ آگے مری تقدیر بڑھی

میں نہ پہچان سکا خود کو تو میری جانب
گردِ ماضی سے اُبھر کر مری تصویر بڑھی

یہ جو اِک بے درو دیوار کا گھر ہے اپنا
اِس سے باہر نہ کبھی حسرتِ تعمیر بڑھی

ہو گیا شعلۂ خاشاک بھی شامل جب سے
آتشِ گُل میں جلا دینے کی تاثیر بڑھی

بادِ صرصر سے بھی معدوم نہ ہونے پائے
کچھ چراغوں کی تو گُل ہو کے بھی تنویر بڑھی

میرؔ تو تاجورِ مُلکِ سخن تھے محسنؔ
لکھنؤ آ کے نہ کچھ میرؔ کی توقیر بڑھی

○

وہی پیروں میں زنجیرِ گراں ہے کیوں نہیں کہتے
وہی دیوارِ زنداں درمیاں ہے کیوں نہیں کہتے

چراغوں کے تو جلنے کا دُھواں ایسا نہیں ہوتا
چراغوں کے یہ بجھنے کا دُھواں ہے کیوں نہیں کہتے

نمو کی ہے توقّع تم کو چوبِ خشک سے کیونکر
تمھارا یہ بھی اک حسنِ گماں ہے کیوں نہیں کہتے

سبب اِن دُوریوں کا کیا ہے، واضح کیوں نہیں کرتے
اگر دیوار کوئی درمیاں ہے کیوں نہیں کہتے

یہیں تو آتش و ناسخ سے رہتے تھے جنوں پیشہ
یہی وہ شہرِ آشفتہ سراں ہے کیوں نہیں کہتے

تمھارے لب پہ اب کیوں ہے یہ مہرِ خامشی محسنؔ
وہ کیا مجبوریِ لفظ و بیاں ہے، کیوں نہیں کہتے

○

میری موجوں کو سمندر میں سمونے والا
ناخدا مجھ کو ملا بھی تو ڈبونے والا

خواب سے جاگے کہ سوتا رہے سونے والا
ہوگا کب تک وہ تماشا جو ہے ہونے والا

جس نے آئینہ دِکھایا تھا مجھے منزل کا
میری راہوں میں تھا کانٹے وہی بونے واالا

میرے غم کی کسے پروا ہے کہ اَب کوئی نہیں
اپنا دامن مرے اشکوں سے بھگونے والا

غم تو اس کا ہے کہ وہ لطفِ جراحت نہ رہا
اب وہ نشتر ہے نہ نشتر کا چبھونے والا

رولے ہر شخص یہاں مرثیہ اپنا پڑھ کر
اب یہاں کوئی کسی پر نہیں رونے والا

تخت ہو جائے گا تختہ ذرا ٹھہرو تو سہی
دیکھ کر جاؤ جو اَب کھیل ہے ہونے والا

○

کہیں بھی اُس سے تو کیا حد یہ خود ستائی کی ہے
کہ اُس کو اپنوں کی پروا، نہ جگ ہنسائی کی ہے

اُسے نگاہ کے جس زاویے سے بھی دیکھو
ادا ادا میں وہی شان کج ادائی کی ہے

یہ ساری جنگ ہے صرف اِک اصول کی خاطر
حصولِ زر نہ زمیں وجہ اس لڑائی کی ہے

میں اُس کو حاتمِ دوراں لکھوں تو کیسے لکھوں
کہ اُس میں ساری ہی خُو بُو جو ہے گدائی کی ہے

سبھی ہیں چہروں پہ چہرے یہاں لگائے ہوئے
بڑے فروغ پہ اب رسم رونمائی کی ہے

کہیں تو حلقۂ زنجیر میں شگاف پڑا
کہ اب یہاں سے کچھ اُمید تو رہائی کی ہے

کیا ہے اپنے ہی ہاتھوں سے میں نے کسبِ ہُنر
یہ جس قدر بھی ہے دولت مری کمائی کی ہے

سخنوروں میں ترا جو مقام ہو محسنؔ
جہاں میں دھوم تو اُس کی غزل سرائی کی ہے

○

کوئی دُھندلی سی بھی تصویر نہ معلوم ہوئی
کچھ مرے خواب کی تعبیر نہ معلوم ہوئی

تیر کی طرح اُتر بھی گئی دل میں وہ نگاہ
لیکن آوازِ پرِ تیر نہ معلوم ہوئی

زندگی ہم ترے پابند ہوئے جس دن سے
پاؤں میں پھر کوئی زنجیر نہ معلوم ہوئی

جانے کس کا یہ قلم ہے، یہ عبارت کس کی
مجھ کو اپنی تو یہ تحریر نہ معلوم ہوئی

روشنی چھن کے نہ دیوار سے آئی اِس پار
شمع جلتی رہی تنویر نہ معلوم ہوئی

جیسے لرزیدہ تھا کچھ دستِ ستم گر محسنؔ
اب کے وہ بُرّشِ شمشیر نہ معلوم ہوئی

○

کِس سے کیا کہا جائے کِس سے کیا سُنا جائے
دِل تو رنگِ محفل کو دیکھ کر بجُھا جائے

قبضہ جب نہ دریا پر دسترس نہ موجوں پر
پھر تو جس طرف چاہے لے کے ناخدا جائے

یا تو چھین لی جائے تیغ اُس کے ہاتھوں سے
ورنہ اُس کے قدموں پر سر کو رکھ دیا جائے

گو ہے یہ ثمر ممنوع چاہتا ہے جی لیکن
توڑ کر اِسے اک دن ذائقہ چکھا جائے

بڑھتا جائے ساحل کی سمت رَو بہ رَو کوئی
لہر لہر پانی میں کوئی ڈوبتا جائے

بزمِ کیف و مستی بھی بن گئی عزاخانہ
اب غزل کا لکھنا کیا، مرثیہ لکھا جائے

کس طرح یہ ممکن ہے گرد و پیش سے محسنؔ
آنکھ پھیر لی جائے منہ چُھپا لیا جائے

○

وہ میرا شمع روشن کر کے ویرانے میں رکھ دینا
قدم جیسے کہیں رہ رو کا انجانے میں رکھ دینا

وہ اِک تارے کا مے خانے میں کل شب ٹوٹ کر گرنا
وہ اُس کا گوہرِ لب میرے پیمانے میں رکھ دینا

کسی کے پاس لکھنے کو نیا کچھ بھی نہیں شاید
وہی کردار باسی تازہ افسانے میں رکھ دینا

ہماری پیاس مے خواروں کو اکثر یاد آئے گی
ہمارے نام کا اک جام مے خانے میں رکھ دینا

گذاری جائے جب نذر اُس شہِ دوراں کی خدمت میں
تو میرا یہ بُریدہ سر بھی نذرانے میں رکھ دینا

نظامِ مے کدہ میں یہ بھی ہے ردّ و بدل کوئی
اُٹھا کر جام اِس خانے سے اُس خانے میں رکھ دینا

مرے گھر سے جو محسنؔ کوئی تصویرِ بُتاں نکلے
اُسے تم احتراماً جا کے بُت خانے میں رکھ دینا

○

جو سانحات مرے ساتھ روز و شب گذرے
تمھارے ساتھ تو وہ سانحات اب گذرے

جُھکا کے سر کسی دربار و در سے کب گذرے
کہ جب بھی گذرے اِسی طرح بے ادب گذرے

ترا ستم تو زمانے پہ آشکارا تھا
ترے کرم پہ مگر شک عجب عجب گذرے

نسیمِ صبح دبے پاؤں جانے کب آئی
نہ جانے رہ گذرِ خواب سے وہ کب گذرے

خزاں نصیبوں کا بس تم سلام کہہ دینا
چمن سے قافلۂ نو بہار جب گذرے

کوئی بتاؤ کہاں جا کے اب وہ پیاس بجھائیں
سمندروں سے بھی ہو کر جو تشنہ لب گذرے

محیط کب سے ہے آسیب کی طرح محسنؔ
دُعا کرو کہ کسی طور اب یہ شب گذرے

○

رفاقتوں کو چلو آزما کے دیکھتے ہیں
چراغ پردۂ شب میں بُجھا کے دیکھتے ہیں

بس ایک نقش سرِ ریگ زار ہے کہ جسے
کبھی بنا کے کبھی ہم مِٹا کے دیکھتے ہیں

یہ دیکھنا ہے کہ اب کیا دکھائی دیتا ہے
یہاں سے دُور بہت دُور جا کے دیکھتے ہیں

سبھی چراغ ہَوا میں جلا رہے ہیں تو پھر
چراغ ہم بھی ہَوا میں جلا کے دیکھتے ہیں

نہ جانے رہتی ہے کس کس کے سر پہ اب دستار
بلند سر سے بھی نیزے ہَوا کے دیکھتے ہیں

یہ کس کے نقش قدم کی ہیں منزلیں جویا
یہ راستے کسے پلکیں بچھا کے دیکھتے ہیں

اُسی کی دادِ سخن ہے جو مستند محسنؔ
تو یہ غزل بھی اُسی کو سُنا کے دیکھتے ہیں

○

وہ کہہ رہے ہیں آؤ تو پندار رکھ کے آؤ
سر پر کوئی کلاہ نہ دستار رکھ کے آؤ

اِس دُھوپ میں سفر کا اگر قصد ہے تو پھر
گھر پر خیالِ سایۂ دیوار رکھ کے آؤ

بزمِ منافقاں ہے یہ آؤ جو تُم یہاں
زیرِ نقاب چہرۂ تہہ دار رکھ کے آؤ

مصلوب ہونا اتنی بڑی بات تو نہیں
پہچان اپنی کوئی سرِدار رکھ کے آؤ

○

کرلیا غیر کی نظروں پہ بھروسا کیسے
تم تو خود بیں تھے تو پھر کھا گئے دھوکا کیسے

انقلابات کی تفسیر میں کیا رکھا ہے
ہم نے دیکھا ہے ، بدلتا ہے زمانہ کیسے

شہر میں چاروں طرف آئینہ بندی تھی تمام
شہر کا شہر مگر ہوگیا اندھا کیسے

رات بھر طوق و سلاسل کی صدا آتی رہی
جانے زنداں میں ہوا ہو گا سویرا کیسے

دن میں کیوں شمع جلا رکھّی ہے دیوانوں نے
شب میں کام آئے گا یہ دن کا اُجالا کیسے

ساتھ تو چھوڑ گئے سارے رفیقانِ سفر
راستہ اب یہ کٹے گا تنِ تنہا کیسے

خیر باد آپ نے دِلّی کو کہا کیوں محسنؔ
اِس خرابے میں ہُوا آن کے بسنا کیسے

○

رستے میں کوئی آ کے عناں گیر ہو نہ جائے
یہ جذبۂ جنوں مرا زنجیر ہو نہ جائے

اُس کو جو اَب کسی سے شکایت نہیں رہی
پھر کیوں وہ سب سے مل کے بغل گیر ہو نہ جائے

میں نے زبان دی ہے تو لب وا کروں گا کیا
لیکن زبانِ خلق سے تشہیر ہو نہ جائے

منظر یہ حشر خیز جو پیشِ نگاہ ہے
ڈرتا ہوں میرے خواب کی تعبیر ہو نہ جائے

آنکھوں میں بس گئی ہے وہ تصویر اس طرح
میری نگاہِ شوق بھی تصویر ہو نہ جائے

محسنؔ نہ جانے صبح نمودار ہو گی کب
یہ شامِ بے چراغ ہی تقدیر ہو نہ جائے

○

موجِ گُل موجِ صبا سب خاموش
تیغِ گلچیں کے سِوا سب خاموش

رُو بہ رُو اُس کے سبھی مُہر بہ لب
کوئی شکوہ نہ گلہ ، سب خاموش

سر قلم ہو گئے کتنوں کے مگر
جیسے کچھ بھی نہ ہوا سب خاموش

سب کو انجان سفر کا دھڑکا
راہ رو، راہ نما سب خاموش

اک تحیّر کا ہے عالم ہر سُو
دُور تک ارض و سما سب خاموش

سب ہوئے دُودِ چراغِ محفل
بُجھ گیا سب کا دِیا سب خاموش

درپئے جاں تھے سب اک دوسرے کے
وہ ملی سب کو سزا سب خاموش

غم گساروں کو ہُوا کیا محسؔن
کچھ دَوا ہے نہ دُعا سب خاموش

○

ڈھوپ میں ہم رہے سرگرمِ سفر راستے بھر
کہیں سایے کو نہ تھا کوئی شجر راستے بھر

کون کس موڑ پہ رخصت ہُوا کچھ یاد نہیں
ہم کو اپنی بھی رہی کچھ نہ خبر راستے بھر

پے بہ پے ہوتا رہا ہم پہ بلاؤں کا نزول
جانے کس کا تھا یہ آسیبِ نظر راستے بھر

وہ جو منزل کے دِکھاتا رہا ہر گام پہ خواب
ساتھ تھا ایسا ہی اک شعبدہ گر راستے بھر

شام ہر گام پہ کرتی رہی ماتم کس کا
کس کو روتی رہی اشکوں سے سحر راستے بھر

قافلہ ایک اسیروں کا تھا پیچھے پیچھے
آگے آگے تھا کوئی نیزے پہ سر راستے بھر

چھوڑ آئے تھے بہت دُور بہت دُور جسے
یاد آتا رہا ہم کو وہ نگر راستے بھر

کیا یہ رودادِ سفر میں نہ لکھا جائے گا
ہم نے اشکوں کو کیا ہے جو گہُر راستے بھر

راستے میں نہ کسی اور کو دیکھا محسنؔ
ہم اُسی کے رہے پابندِ نظر راستے بھر

○

اپنی حدِ پرواز سے اُونچے جو اُڑے ہم
آکاش نہ پاتال کہیں کے نہ رہے ہم

تھی چند ہی لمحوں کو نمود اپنی سرِ شاخ
اک بار جو مُرجھائے دو بارہ نہ کِھلے ہم

اِس شہر میں اک رات کا ہے اپنا بسیرا
بس رات ڈھلی، صبح ہوئی اور چلے ہم

اے موجِ بلا! تجھ کو خبر ہوگی ہماری
ساحل کہ سمندر تھا کہاں غرق ہوئے ہم

ہنس بول لیا کرتے تھے پہلے تو سبھی سے
پھر ایسی لگی چپ کہ کسی سے نہ کُھلے ہم

ہم ضبط کے ماروں کے لیے شادی و غم کیا
جی بھر کے نہ محسنؔ کبھی روئے نہ ہنسے ہم

قلمی نام : محسن زیدی

نام : سیّد محسن رضا زیدی

پیدائش : ۱۰ر جولائی ۱۹۳۵ء

وطن : بہرائچ (اتر پردیش)

تعلیم : بی۔اے (انگریزی ادب، تاریخ، معاشیات) الہ آباد یونیورسٹی ۔ ۱۹۵۴ء
ایم۔اے (معاشیات) لکھنؤ یونیورسٹی ۔ ۱۹۵۶ء

پیشہ : ریٹائرڈ جوائنٹ سکریٹری، انڈین اکنامک سروس، گورنمنٹ آف انڈیا

سکونت : ۵۳/۱۸، اِندرانگر، لکھنؤ-۲۲۶۰۱۶ فون: ۳۵۶۰۱۸

تصانیف : شعری مجموعے

- شہرِ دل ۱۹۶۱ء
- رشتۂ کلام ۱۹۷۸ء
- متاعِ آخرِ شب ۱۹۹۰ء
- بابِ سخن ۲۰۰۰ء

انعامات : 'رشتۂ کلام' اور 'متاعِ آخرِ شب' پر اتر پردیش اردو اکادمی انعامات

بیرونی ممالک کا سفر : جاپان، سنگاپور، ہانگ کانگ، تائیوان، انڈونیشیا، ملیشیا، تھائی لینڈ، الجیریا